

Anwari Begum of Safia Bilgrami and Cultural Equilibrium**صفیہ بلگرامی کا انوری بیگم اور ثقافتی توازن****¹Muhammad Naeem**¹Associate Professor, Institute of Language and Literature, Punjab University, LahoreCorrespondence Email: naeem.urdu@pu.edu.pkpISSN: 3007-2077
eISSN: 3007-2085HEC approved in
Y categoryReceived: 20-11-2024
Accepted: 03-01-2025
Online: 09-01-2025

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license.

Copyright: © 2024 by the author(s).

Abstract

The reformist discourse in Urdu novels set in with the inception of novelistic genres. Male novelists, while reforming the hitherto social norms, used the novelistic genre to give new female roles in the didactic tone. But the reformist discourse opened limited avenues for female liberty. The novel *Anwari Begum* by Safia Begum expands the scope of feminism in the Urdu reformist discourse. Through this narrative, she turns the possibility of falling in love with a girl with her cousin and marriage into reality. There are more than one twist and turn in this love story, and between these twists and turns, reform, prosperity, and the social interaction of men and women are discussed. The author's attitude towards women in the narrative is sympathetic. They have tried to establish a balance between religion, indigenous culture, and foreign culture, in which they are averse to the East and not wary of the West. This article explores the expansion of female social roles through the critical discourse analysis of Safia Begum's narrative.

Keywords:

Safia Bilgrami, Anwari Begum, Discourse Analysis, Social Roles, Female Agency, Modernity

انگریز خواتین کا مقامی عورتوں سے تقابل کو لو نیل عہد کے ناول میں اصلاحی بیانیے سے منسلک ہے۔ ہندو مسلم اشراف کے ہاں، (جن کی نمائندگی استعماری دور کے اردو ناول میں ملتی ہے)، سماج مرد و زن کے دو الگ منطقوں میں منقسم تھا جنہیں پردے کے ذریعے سماجی طور پر علیحدہ قائم رکھا گیا تھا۔ سماج کی تعمیر میں مرد و زن کی ذمہ داریاں واضح اور ممیز تھیں۔ زنانہ ذمہ

داریوں میں خانہ داری اور زنانہ سرگرمیوں کے لیے درکار ہنرمندیوں کے تقاضوں میں عام تعلیم کا مطالبہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد عام تعلیم کے تصور اور ملازمتوں کی انگریزی تعلیم کے ساتھ وابستگی نے اشراف کے لیے جس نئی صورتِ حال کو جنم دیا، اس میں گھریلو عورت کی تعلیم اور نئی ہنرمندیوں کے تقاضے پیدا ہوئے جس سے تعلیم نسواں کے تصور نے جنم لیا۔ دوسری طرف سماجی میل جول میں انگریز مردوں کے علاوہ ولایتی عورتوں کی موجودگی نئے سماجی تعاملات (social interactions) کو جنم دے رہی تھی۔ ایسے تعاملات نے اصلاحِ نسواں کی سماجی ضرورت کو مہمیز دی۔ انگریزوں کی بطور حاکم موجودگی بھی مقامی ذہن کے مرعوبی مشاہدے کو ایک خاص رنگ عطا کر رہی تھی، جس میں حاکموں کی سیاسی پیروی کے ساتھ علمی اور تہذیبی متابعت کے رستے بن رہے تھے۔ انھی رستوں کی تفصیلات میں بدیسی اور دیسی خواتین کی نمائندگی کے دوران میں متضاد ثنوتوں کا بیانیہ صورت پذیر ہوتا ہے۔ لیکن ان نمائندگیوں کو جو ہریت پسندی کے تحت ہانک لینا مناسب نہ ہو گا۔ یہاں انگریز پرست موجود ہیں، تو انھیں ملازم رکھنے والے بھی اشراف بھی ہیں۔ انھیں میم صاحب کہہ کر مخاطب کرنے والی ملازمین ہیں، تو انھیں تم کہہ کر حکم دینے والی بیگمات بھی ہیں۔^۲

طیبہ بلگرامی کے ناول انوری بیگم (۱۹۰۹) میں انگریزی خواتین کے کردار مرکزی حیثیت کے حامل نہیں ہیں۔ ان میں لے دے کر ایک نرس کا کردار ہے جو بیمار انوری کی تیمارداری کے لیے نقی علی خان نے ملازم رکھی ہوئی ہے۔ طیبہ نے اس ناول میں بیانیے سے زیادہ مکالموں سے کام لیا ہے۔ ناول کے پہلے باب میں نرس کے مکالموں سے واضح کیا گیا ہے کہ وہ مقامی نہیں ہے (نرس: ہم احمدی بی بی کے کمرے میں سوتا تھا اور بی بی ان کے پاس تھا۔ نرس کو بلانے کے لیے ماما آتی ہے تو اسے "میم صاحب" کہتی ہے، جبکہ اسی نرس کو نقی علی خان کی بیوی جمیلہ بیگم اس طرح پکارتی ہے: "نرس! تم لڑکی کے پاس سے آئی ہو؟" دونوں خواتین نے حفظِ مراتب کے لحاظ سے مخاطبت کا الگ الگ انداز اپنایا ہے۔ دونوں کے ہاں نرس کی حیثیت کو مکالمے کے الفاظ اور خطاب سے ہی واضح کر دیا گیا ہے۔ یوں کلامیے میں بدیسی خاتون کی پیشکش میں یک رنگی پیدا نہیں ہوتی اور اس تصور کو تقویت ملتی ہے کہ اردو ناول کے عمومی بیانیے میں بدیسی خاتون کی پیشکش اکہری نہیں ہے۔

انوری بیگم میں حیدرآباد کی مقامی اشراف خواتین کے ہاں انگریزی اثرات بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان اثرات کی پیش کش دیگر ناولوں سے مختلف ہے۔ یہاں مسلم اشراف کی لڑکیاں بیڈمنٹن کھیلتی نظر آتی ہیں اور چچا زاد سے ہاتھ بھی ملا لیتی

ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس نذیر احمد کے ناولوں سے نسوانی اصلاح کی شروع ہونے والی عملیدگی (process) میں زنانہ علیحدگی (seclusion) ایک قدر کے طور پر مستحکم رہتی ہے۔ خاتون کا کردار اپنی فعالیت کے باوصف اس سماجی حدود سے باہر کم ہی قدم رکھتا ہے، جو انگریزوں کی آمد سے قبل، یا ان کے زیر اثر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ابتدائی عرصے میں قائم تھا۔ اس کی ایک سے زائد ممکنہ وجوہ ہو سکتی ہیں۔ نذیر احمد کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ وہ تبدیلی کے سرخیلوں میں سے تھے۔ ان کے ناول مرآة العروس (۱۸۶۹) اور طیبہ بیگم بلگرامی کے انوری بیگم (۱۹۰۹) میں ۴۰ برس کا فصل ہے۔ طیبہ بیگم نواب زادی تھیں۔ اسی طرح دونوں میں ایک امتیاز علاقائی بھی ہے۔ دلی اور حیدرآباد کے مسلم اشراف کی تہذیبی زندگی میں کم از کم ناولوں کی پیشکش میں واضح فرق نظر آتا ہے۔

ناول میں تبدیلی کے لیے معیار انگریزوں کو بنایا گیا ہے، جو اسے کولو نیل دور کے نسوانی اصلاح کے لیے لکھے گئے ناولوں کی روایت سے منسلک کر دیتا ہے۔ طیبہ بلگرامی کے نسوانی اصلاح کے حوالے سے بعض خیالات اپنے معاصرین کی نسبت خاصے جدت کے حامل ہیں۔ اگر ان کی زندگی پہ نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود ایک روایتی گھرانے کا نسوانی فرد ہونے کے باوصف مسلسل اپنے شوقِ تعلیم کو مہمیز دیتی رہیں اور خواتین کی بہبود کے لیے عملی جدوجہد کرتی رہیں۔ انھوں نے اپنی کوششوں اور مطالعے سے شادی کے بعد بھی تعلیمی امتحانات (بی اے تک) پاس کیے اور کم از کم دو انجمنیں قائم کیں۔ ان کی قائم کردہ "حیدرآباد لیڈیز ایسوسی ایشن" کی صدر مسز واکر تھیں اور اس انجمن میں ہر مذہب و ملت کی خواتین شریک ہوتی تھیں۔ اسی طرح صرف مسلم خواتین کے لیے "انجمن خواتین اسلام" قائم کی۔⁴ ان کے مطالعے اور مجلسی زندگی نے ان جدت پسندانہ خیالات کی پرورش میں اہم کردار ادا کیا ہوگا۔

طیبہ بیگم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذمہ دار مردوں کو سمجھتی تھیں۔ انوری بیگم کا کردار سجاد حسین اپنے مکالموں میں ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ لندن پلٹ نوجوان ہے۔ لیکن اس کی تعمیر میں مقامی روایات، جیسے وفا شعاری اور محبت میں توحید پسندی بھی دکھائی گئی ہیں۔ اسے انوری کا حسن اور حسن سلوک اس قدر متاثر کرتے ہیں کہ جلوہ افرونگ سے اس کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں۔ انوری کی بیماری پہ اس کا طرز عمل ایک عاشق صادق کا ہے۔ اس کا اظہار محبت میں انوری کے پاؤں میں گرنا، اس کی بیماری میں اپنی تمام سرگرمیاں موقوف کر کے اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا اور دوکھلانا اور بار بار خود چائے بنا کر پلانا،

ایک ایسے مردانہ کردار کی خبر دیتے ہیں، جو اپنے معاصرین سے خاصا مختلف ہے۔ شمالی ہند کی متوسط طبقے کی مردانہ پسند ثقافتی روایات کے مقابلے میں سجاد حسین ایک بااعتماد اور بڑی حد تک نئے سماجی رجحانات کا اشارہ دیتا ہے، جس کے کندھوں پر جاگیر دارانہ قدروں کا بوجھ نہیں ہے۔ اس کے ممکنہ اسباب میں حیدرآباد کے ساتھ ساتھ لندن میں گزارے دس برسوں کا تجربہ بھی شامل ہے، جہاں کے بارے ہمیں ناول میں بتایا جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کی غم خوار اور زندگی کے میدان میں شانہ بشانہ کھڑی ہیں۔ ان اسباب کے ساتھ ساتھ ایک زیادہ اہم سبب مصنف کی صنف (gender) ہے۔ صنفیہ بیگم بلگرامی، راشدا الخیری کی ادارت میں نکلنے والے رسالے عصمت کی لکھاریوں میں شامل ہیں۔ راشدا الخیری نے بھی اصلاح نسواں کو موضوع بنایا ہے۔ دونوں مصنفین کا کلامیہ طبقہ نسواں کے باب میں بعض واضح امتیازات رکھتا ہے۔ راشدا الخیری جنہیں مصورِ غم کی بجائے مصورِ ظلم کہنا چاہیے۔ عورتوں کے مصائب کی ذمہ داری عورتوں پہ ہی رکھتے ہیں۔ ان کے کلامیہ میں نزلہ عضوِ ضعیف پہ گرتا ہے۔ ان کے ناولوں میں جدت پسند خواتین سے یک گونہ بے محسوس ہوتا ہے۔ وہ جدید خواتین کو مادہ پرست تصور کرتے ہیں، جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد شوہروں کی خدمت گزار مہترک کر دیتی ہیں، جبکہ طیبہ بیگم کے نسوانی کردار (انوری اور احمدی) انگریزی کھیل اور تعلیم کے باوصف پردہ ترک کرتے ہیں نہ شوہروں کا احترام چھوڑتے ہیں۔

انگریزوں کو معیارِ معاشرت بنانے کا کلامیہ اس ناول میں زیریں اور بالائی دونوں سطحوں پر موجود ہے۔ زیریں سطح پر دیکھیں تو نوجوان کرداروں کا طرزِ حیات اور باہمی جذبات بڑی حد تک جدت پسندانہ ہیں۔ مثلاً جیون ساتھی کے انتخاب میں کم از کم مردوں کی رائے کا احترام کیا جا رہا ہے، البتہ نسوانی کرداروں سے رائے طلب نہیں کی گئی۔ ہاں قریبی عزیزوں کے لڑکوں لڑکیوں میں آزادانہ میل جول دکھایا گیا ہے، جو کبھی بھی شرعی حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔ اسی طرح نسوانی صحت ایک ایسا موضوع ہے جو رفتہ رفتہ اور کسی حد تک غیر محسوس انداز میں ناولوں کے مجموعی کلامیہ کا حصہ بن رہا ہے۔ سرشار کے ہاں اول اول اس بات کا احساس ابھرتا ہے کہ شمالی ہند کے شرفا کی خواتین کی زندگی پردے کے سبب تندرست طرزِ حیات سے کوسوں دور ہے۔ فسانہ آزاد کی حسن آرا اپنی بہن اور ماں کے ساتھ ہو خوری کرتی ہے، لیکن پردہ قائم رکھتے ہوئے۔ شہر کے ہاں بھی پردے کے سبب نسوانی صحت کو درپیش مسائل کی طرف اشارے موجود ہیں۔^۸ صنفیہ بلگرامی نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اپنے اشراف نسوانی کرداروں کو ایسی سرگرمیوں میں مشغول دکھایا ہے جو جدید اور صحت بخش ہیں۔ بیڈ منٹن کا مشورہ سجاد حسین

دیتا ہے جسے اس کے چچا علی نقی خان کسی حیل و حجت کے بغیر قبول کر لیتے ہیں۔ اس آمادگی کا سبب بھی صفیہ بلگرامی نے بیان کر دیا ہے۔

"علی نقی خان --- کا خیال تھا کہ جتنی آزادی پردے کے ساتھ ممکن ہو عورتوں کو دینی چاہیے۔ اور ان کی دماغی اور جسمانی نشوونما میں ہر قسم کی کوشش کرنا وہ ایک ثواب کی بات تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر گھر کی عورتوں کو کتابیں پڑھ کر سنا تے۔ بعض بعض انگریزی قصے اپنی بی بی کو اردو میں ترجمہ کر کے سنا تے۔ اور اکثر چاندنی رات کو گھوڑے کی گاڑی میں باغوں کی سیر کراتے۔ گرمیوں کے موسم میں پہاڑوں پر چار چار مہینے اپنے گھر والوں کو بھیج دیا کرتے۔ ان کے عالی اور مقدس دماغ میں کبھی بدگمانی کا بھوت نہ گزرتا تھا۔"

محدود آزادی کا یہ طرز عمل آج ہو سکتا ہے پڑھنے والوں کو بہت عام محسوس ہو، لیکن اگر اپنے زمانے کے طرز معاشرت کی روشنی میں دیکھا جائے تو خاصا جدت پسندانہ محسوس ہو گا۔ اس عبارت میں کلامیاتی تجزیے کے ضمن میں خاص الفاظ "عالی اور مقدس دماغ" اور "بدگمانی کا بھوت" ہیں۔ صفیہ بیگم کے کلامیے میں عورتوں کی محدود زندگی کا سبب مردوں کی بدگمانی ہے۔ اور جو مرد انہیں مناسب آزادی دیتے ہیں وہ عالی اور مقدس دماغ رکھتے ہیں۔ خیال کا یہ اسلوب انہیں معاصرین سے مختلف بناتا ہے۔ جس سماج میں یہ تصور موجود ہو "عورت رہے تو آپ سے، نہیں تو سگے باپ سے" اور ان کا "تربیا چتر" معروف ہو، وہاں یہ بات کرنا کہ نسوانی جہالت اور پسماندہ زندگی کا سبب مردوں کی بدگمانی اور کم دماغی ہے، خاصے حوصلے کا کام ہے، جو صفیہ بیگم کے ہاں موجود ہے۔

انوری بیگم میں انگریزوں کی معاشرت سے اثرات قبول کرنے یا ان کی طرف متوجہ کرنے میں دو کرداروں کا خصوصی عمل دخل ہے۔ ایک انوری کی خالہ راحت بیگم ہیں اور دوسرا کردار سجاد حسین ہے۔ سجاد حسین لندن سے تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور قریب دس برس وہاں گزارے ہیں۔ اس لیے اس کے تصورات میں انگریزی معاشرت کے بعض پہلوؤں کے لیے پسندیدگی کا ملنا اچھے کی بات نہیں۔ البتہ راحت بیگم کی انگریز پسندی کی وجہ ناول میں بیان نہیں کی گئی۔ دونوں کرداروں میں سے سجاد حسین کا طرز عمل زیادہ متوازن ہے۔ وہ دیسی اور بدیسی دونوں معاشرتوں کا مرقع ہے۔ اگر دیکھا جائے تو راحت بیگم کی ذاتی زندگی بھی دیسی اطوار سے گزرتی ہے لیکن اس کے ہاں ہر بات میں انگریزوں کو معیار بنانے کا جوش ملتا ہے، جس کی کوئی توجیہ

ناول میں موجود نہیں۔ بظاہر اس کا کسی انگریز خاتون یا مرد سے کسی بھی نوع کا کوئی میل جول نہیں۔ اس کے باوجود وہ ہر بات میں انگریزوں کو معیار منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی انگریز پسندی سے ہمارا اولین سابقہ پہلے باب میں ہی ہو جاتا ہے جہاں وہ انوری کی بیماری پہ سب گھروالوں کو پریشان دیکھتی ہے تو اپنی بھانجی احمدی کو سمجھانے کے لیے مثال انگریزی خواتین کی دیتی ہے:

”میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ اس قدر پریشان ہونے سے کیا فائدہ ہے؟ کیا پریشانی سے کچھ بیماری گھٹ جاتی ہے؟ یا پریشانی کوئی ٹوٹکا ہے کہ جس سے فوراً شفا ہو جاتی ہے؟ انگریزوں کو دیکھو! ان کے ہاں عورتیں کیسی بہادر ہوتی ہیں۔ گھبرانا، پریشان ہونا جانتی ہی نہیں۔ صبر اور سہولت سے کام لیتی ہیں۔ ان کے ہاں منتیں ہیں نہ مرادیں ہیں۔ صرف ان کی مستقل مزاجی ان کے کام آتی ہے۔ بیمار کی تیمارداری بھی کرتی ہیں اور وقت پر آرام بھی کر لیتی ہیں۔ سوتی ہیں، ہو انوری کو جاتی ہیں۔ غرض کچھ بھی ہو جائے وہ اپنے آرام و راحت میں خلل نہیں آنے دیتیں۔“¹⁰

راحت بیگم کا متوجہ کرتا ہوا تنبیہی انداز "انگریزوں کو دیکھو" سے ظاہر ہو رہا ہے۔ انھوں نے پریشانی کے عالم میں انگریزی طرزِ عمل کی تقلید کا مشورہ دیا ہے۔ اس مشورت میں مستقل مزاجی اور ذاتی راحت کو مرکزیت حاصل ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ انوری کی بیماری پر گھر کی سبھی عورتیں گھبراہٹ کے عالم میں اپنی سدھ بدھ کھوئے بیٹھی ہیں اور انھیں گھر کی مائیں، ملازمائیں کچھ ہمدردی سے کچھ چالاکی سے توہمات کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ ایسے عالم میں راحت بیگم کے یہ بیانات عمومی نسوانی کلامیے کے بالمقابل ایک مختلف کلامیہ تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ ایک متوازی معاشرت کو استعمال کر رہی ہیں، جس کی حیثیت مطلوب معیار کی سی ہے۔ چونکہ راحت بیگم کے ان بیانات پر راوی کی طرف سے کوئی تبصرہ (پسندیدہ یا ناپسندیدہ) موجود نہیں اور نہ اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ یہ خیالات راحت بیگم نے کس طرح حاصل کیے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مصنفہ نے ایک متبادل فراہم کرنے کے لیے راحت بیگم کا مکالمہ استعمال کیا ہے۔ راحت بیگم کے یوں سمجھانے بچھانے سے انوری کی پریشان ماں چائے پینے اور آدھا بسکٹ کھانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ راحت بیگم کی اس خطابت کا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے۔ یہاں یہ امر دلچسپ ہے کہ ہمت و حوصلے کے لیے راحت بیگم نے کوئی مقامی مثال استعمال نہیں کی۔ جس کی دو توجیہیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ انوری کی ماں جبیلہ بیگم اور اس کی بہن احمدی کا طرزِ عمل عام اشراف زادوں کا ہے، جو دوسرے کی

مصیبت یا بیماری پہ ہمت ہار بیٹھتی ہیں اس لیے کوئی مقامی مثال راحت بیگم کو نہیں ملی۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ انگریزوں کی تقلید ایک معروف قدر کے طور پہ رائج ہو چکی ہے اس لیے اگر ان کی کوئی مثال پیش کر دی جائے تو لوگ توجہ سے سنتے اور اس پہ عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ بعد الذکر توجیہ اس لیے کی جاسکتی ہے کہ اس ناول کے علاوہ کئی اور ناولوں میں انگریزوں کی ایسی تقلید پسندی کی مثالیں بغیر کسی تردد کے باسانی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً نذیر احمد کے ناولوں بنسات النعش (۱۸۷۲) میں میم صاحب کا گھرانہ ہو یا ایامی (۱۸۹۱) کی مس میری دونوں مقامی خواتین کے لیے زندگی کرنے کے بعض ایسے نئے اطوار لے کر آتی ہیں جو اجتماعی تہذیبی حوالے سے "بھی لائق تحسین ہیں اور انفرادی حوالے سے بعض ایسے کرداری اوصاف سامنے لاتے ہیں جو مقامی خواتین کے لیے دلکشی اور جذباتی اور ذاتی زندگی میں شعورِ ذات کا سامان بنتے ہیں۔" سرشار کے معروف ترین ناول فسانہ آزاد کا مرکزی کردار آزاد انگریز پسندی کی نمایاں ترین مثالوں میں سے ہے۔^۳

راحت بیگم کی انگریز پسندی ایک اور موقع پر بھی ظاہر ہوتی ہے۔ سجاد اور انوری کے درمیان پسندیدگی کا تعلق ہے۔ سجاد اس سے اظہارِ محبت کر چکا ہے۔ سجاد کے والد سید کاظم حسین نے اپنے بھائی علی نقی خان کے گھرانے کی دعوت کی ہے۔ سجاد گھر اور خود کو سجانے میں خصوصی اہتمام کرتا ہے کہ انوری آئے گی۔ علی نقی کے گھرانے کے تمام لوگ دعوت میں آتے ہیں لیکن انوری نہیں آتی۔ خود انوری بھی چاہتی ہے کہ جائے لیکن جذباتی کشمکش اور شرم و حیا کے باعث وہ پہلے انکار کر دیتی ہے اور بیماری کا بہانہ بناتی ہے۔ بعد ازاں سجاد سے ملنے کی بے تابی میں وہ دل ہی دل میں جانے کا منصوبہ بناتی ہے اور راحت بیگم سے کہتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ اس پر راحت بیگم ناراضگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس کی ناراضگی دیسی و بدیسی خواتین کے تقابل کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ برافروختہ ہو کر جواب دیتی ہے:

واہ! کیا خوب! عجب تم لوگوں کی طبیعت ہے۔ گھڑی میں کچھ، گھڑی میں کچھ! اگر جانا تھا تو کاظمی بیگم کے ساتھ کیوں نہ چلی گئیں؟ میں اس وقت نہ جاؤں گی۔ تم لوگوں نے انگریزی تو پڑھی ہے مگر انگریزوں کے اخلاق تم کو کبھی نہ آئیں گے۔ انگریزوں کی لڑکیاں کس قدر شائستہ اور ہنرمند ہوتی ہیں۔ تمام دن چھوٹے بھائی بہنوں کے واسطے کپڑے سینا، ریشم کا کام بنانا اور پھر ہر شام کو بن ٹھن کر نکلتی ہیں۔ ایک تم لوگ ہو کہ تمام دن ادھر گری، ادھر پڑی رہتی ہو۔ سبب یہ ہے کہ کبھی تم لوگوں پر روک ٹوک رہی نہیں۔ جو جی چاہا کیا۔ ماں باپ

ہمیشہ تمہارے تابع رہے۔ جو کہا کر دیا۔ نہ خود نصیحت کی نہ دوسروں کو کرنے دی کہ بچوں کا
دل کڑھے گا۔^{۱۳}

راحت بیگم کے یہ خیالات کیا اس کے مشاہدے کا نتیجہ ہیں؟ کیا دیسی خواتین بالکل ہی بے کار پڑی رہتی تھیں۔ اگر
صرف اس ناول کے نسوانی کرداروں کو دیکھیں تو ملازماؤں کی فوج ظفر موج میں ان کے کرنے کا کچھ کام کم ہی باقی بچتا ہے۔ لیکن
گھر کے عمومی کاموں کا سلیقہ انوری اور احمدی دونوں کو ہے۔ راحت بیگم کے اس تقابل میں انگریز لڑکیوں کا طرز عمل پسندیدہ بنا کر
پیش کیا گیا ہے۔ راحت کے اپنے طرز زندگی پر تو کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی گئی، البتہ اس کے خیالات واضح طور پر انگریز پسندانہ ہیں۔
انھیں انوری سے اس وقت شکایت ہے کہ وہ انگریزی تعلیم سے واقف ہے لیکن انگریزی اخلاق نہیں سیکھ سکی۔ انگریزی اخلاق کا
جو نمونہ انھوں نے درج کیا، ان کی سرگرمیوں میں سوائے بن ٹھن کر نکلنے کے اور کوئی ایسی سرگرمی نہیں جو دیسی خواتین کے ہاں
ناپائی جاتی ہو۔ ان کا وعظ انوری کی جذباتی کیفیت کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت وہ قیام نہ لی رہیں۔
انھیں بالکل اندازہ نہیں کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے۔ انھیں بس اپنا وعظ کہنا ہے۔ آگے چل کر بیانے میں انوری کی کیفیت کے بیان
میں طیبہ بیگم نے لکھا کہ "راحت بیگم اپنی ہانکتی رہیں۔" جس سے کہنا آسان ہے کہ طیبہ بیگم کی ہمدردیاں انوری کے ساتھ ہیں۔
وہ یہ تو بتا رہی ہیں کہ دیسی لڑکیاں ادھر ادھر پڑی رہتی ہیں لیکن جو سرگرمیاں انھوں نے تجویز کی ہیں، ان میں بھی بیٹھے رہنے کا
کام ہی زیادہ ہے۔ ہاں بن ٹھن کر نکلنے والی بات مستزاد ہے، جو اشراف طرز زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے اُس وقت تو ناممکن معلوم
ہوگی۔

راحت بیگم کے وعظ میں ایک اور پہلو والدین اور بچوں کے تعلق سے متعلق ہے۔ ان کے بیان کے مطابق والدین بچوں
کی خوش نودی کے لیے انھیں سمجھانے بچھانے یا روک ٹوک سے رکے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں بچے من مانیاں کرتے ہیں۔ یہ
نقطہ لڑکوں کے باب میں تو کوئی اہمیت رکھتا ہے، اس زمانے کی اشراف لڑکیوں کی زندگیوں میں تحدیدات کو دیکھتے ہوئے پیٹ بھر
کر بگڑنے کے امکانات زرا کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔

انوری بیگم میں متضاد شنویت کا اظہار شادی کی رسم و رواج کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔ یہاں مصنفہ نے جو جدت کا
کلامیہ تشکیل دیا ہے وہ دیسی اور بدیسی ثقافتی ادغام پر مشتمل ہے۔ راحت بیگم کے روزمرہ زندگی میں انگریزوں کو معیار بنانے اور
ان پر مصنفہ کی طرف سے کسی واضح مخالفت کی (جو منفی پیشکش کی صورت ہو سکتی ہے، مرکزی کرداروں کی مخالفت کی شکل میں

ہو سکتی، یا مکالموں میں مباحثے کی صورت) عدم موجودگی میں یہ کہنا آسان ہے کہ ایسے ثقافتی عناصر موجود ہیں جن میں مصنفہ کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف ہے۔ رسم و رواج کی نمائندگی کا جو طور اس ناول میں اپنایا گیا ہے، اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ دیسی رسم و رواج سے قربت یا دوری کے اسباب سماجی بھی ہیں اور افادی بھی۔ ناول کا اہم کردار سجاد حسین، جس کی پیشکش سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مثالی نوجوان مرد ہے، جس میں پسندیدہ دیسی روایات اور مطلوب بدیسی تصورات مجتمع ہو گئے ہیں۔ اس کو رسم و رواج سے کد ہے۔ اس کی منگنی بچپن میں نانی کی خواہش پر خالہ زاد سے کر دی جاتی ہے۔ اس کی خالہ لیاقت النساء کو ناخواندہ اور ضدی طبیعت کا دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی قدرت السجان کی شادی رسم و رواج سے کرنا چاہتی ہے۔ سجاد کو قدرت السجان سے شادی منظور نہیں کہ وہ ناخواندہ ہے۔ بات محض اتنی نہیں ہے۔ سجاد کے اپنے چچا کے گھر آ جا رہا اور انوری اور احمدی کے ساتھ روزمرہ میل جول نے اس کے دل میں ان بہنوں کی قدر قائم کر دی ہے۔ وہ انوری کی تیمارداری کے سلیقے سے متاثر ہوتا ہے اور دونوں کی تعلیم و تربیت اسے موہ لیتی ہے۔ بیانیے میں انوری اور قدرت السجان کی پیشکش کا حصہ غیر مساوی ہے۔ اس کی ایک سادہ وجہ تو انوری کا مرکزی کردار ہونا ہے، ناول کا عنوان بھی اسی کے نام پر ہے۔ لیکن قدرت کو بیانیے میں جتنی جگہ دی گئی ہے وہ احمدی، حتیٰ کہ کاظمی سے بھی مختصر ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کے کردار کی منفی تصویر ابھاری گئی ہے۔ وہ جھگڑا لوبہ ہے۔

یہاں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اصلاح نسواں کا بیڑا اٹھانے والے اکثر ناول نگار تعلیم اور سلامتی طبع کو ایک جگہ رکھتے ہیں اور ناخواندگی اور جھگڑا لوبہ طبیعت کا انضمام دکھاتے ہیں۔ ان دونوں سیٹوں (sets) میں کہیں علت و معلول کا تعلق (causal relation) قائم کیا گیا ہے اور کہیں ہم رشتگی (co-relation) کے ذریعے دونوں کو منسلک کیا گیا ہے۔^{۱۵} اگرچہ کہیں بھی ایسا واضح طور پر نہیں کہا گیا کہ تمام کی تمام ناخواندہ خواتین جھگڑا لوبہ ہوتی ہیں، تاہم کلامیے کی حد تک ناخواندہ سلیم الطبع خاتون کی پیشکش کم ہی کی گئی ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو متضاد ثنویت کی تحدید ہے۔ ناول نگار عمومی حقیقت پسند بیانیے کے برعکس نظریاتی بیانیے تشکیل دے رہے تھے، اس لیے حقیقت کو کسی خاص زاویے سے دکھانے پر مجبور تھے۔ کسی خاص نکتے (جیسے جدید تعلیم) پر بیانیے کی بنا رکھنے کا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مظاہر کو دو خانوں میں واضح طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ سجاد کا انوری سے لگاؤ ذاتی مشاہدے اور تجربے کی دین ہے، جبکہ قدرت سے اس کی ناپسندیدگی سنی سنائی اور استخراجی منطق پر قائم ہے۔ اسے لگتا ہے کہ قدرت اپنی ماں جیسی ہی ہوگی۔ بیانیے میں بڑی بیبیوں کے ذریعے اس کے اس استخراج کے

بالمقابل دلائل رکھے گئے ہیں، لیکن جذباتی تجربے پر عقلی دلائل کو ترجیح دینا، کم از کم نوجوانی میں آسان نہیں ہوتا۔ پھر سجاد کی انوری سے شادی کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے پلاٹ میں لیاقت النسا کی بے لیاقتی کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہیں رسموں پر وہ بیانیہ تخلیق ہوتا ہے جس میں سماجی روایت کے بالمقابل افادہ پسندی (utilitarianism) کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ افادہ پسندی کا بنیادی تصور انسانی خوشی کو انتہا (maximize) تک لے کر جانا ہے۔ اس فلسفے میں نتائج کو خوشی اور ناخوشی کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔^۶ لیاقت النسا کو دھوم دھڑکے اور رسم و رواج کے بغیر اپنی بیٹی رخصت کرنا منظور نہیں۔ اپنے جذباتی مکالموں میں وہ دہائی دیتی ہے کہ وہ کسی کی محتاج ہے نہ اس کی بیٹی کسی کی باندی ہے جو اسے سادہ طور سے بیاہ دیا جائے۔ لیاقت النسا کے لیے رسم و رواج اپنا پندار دکھانے کا ذریعہ ہیں۔ اس کے دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ شادی کے موقع پر دل کے حوصلے نکالنا امارت کی شان ہے۔ ایسا نہ کرنے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ کوئی اپنی بیٹی کو بوجھ سمجھتا ہو اور اسے سادگی سے رخصت کر دے۔ اس کی ضد کو مصنفہ نے "تزیات" قرار دیا ہے، جو قدیم ہندوستانی تصور ہے، جس کے مطابق بچے اور عورتیں ایک جیسے ضدی اور نا سمجھ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سجاد ایک انجمن قائم کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعے شادی کی رسمیں اجتماعی طور پر موقوف کر دی جائیں اور غربا کی حالت سدھارنا ہر امیر کا فرض قرار دیا جائے۔ سجاد کے یہ اصلاحی منصوبے اس زمانے کے عمومی کلامیے کا حصہ ہیں، جس کے فروغ میں اردو ناول پیش پیش تھا۔ افادہ پسندی کے زاویے سے دیکھیں تو لیاقت النسا اور سجاد دونوں کی خوشی کا پیمانہ انفرادی اور اجتماعی پہلو رکھتا ہے۔ لیاقت النسا کے لیے رسم و رواج کی ادائیگی اپنی ذاتی تسکین اور سماجی مقبولیت دونوں کا ذریعہ ہے۔ سجاد کے لیے ترکِ رسوم اجتماعی بہبود کے ساتھ ذاتی خواہش کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے۔ یہاں یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ اگر سجاد کے ہاں انوری سے شادی کی ذاتی خواہش نہ ہوتی تو تب بھی وہ رسوم کو ترک کرنے کی بات کرتا؟ اس کا جواب سجاد کے کردار میں موجود ہے۔ وہ سماجی تبدیلیوں کا خواہاں ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ محض مردوں کی تعلیم سے سماجی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لڑکا جب اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی ترقی یافتہ ملک جاتا بھی ہے تو بچپن اور لڑکپن میں جو باتیں وہ سیکھ چکا ہے، وہی اس کا ورلڈ ویو بناتی ہیں۔ اس لیے بچپن اور لڑکپن میں تعلیم یافتہ ماں کی صحبت ہی بنیادی تبدیلی لاسکتی ہے۔

صافیہ بیگم کا یہ ناول اس طرح اصلاحی کلامیے میں نسوانی دائرہ کار کو وسعت دیتا ہے۔ اس بیانیے کے ذریعے وہ پچازاد سے محبت اور پھر شادی کے امکان کو حقیقت میں بدلتی ہیں۔ محبت کی اس کہانی میں ایک سے زائد موڑ آتے ہیں اور انھی گردشوں

کے درمیان اصلاح، بہبود اور مرد و زن کے سماجی تفاعل زیر بحث آتے ہیں۔ بیانے میں طبقہ نسواں کی طرف مصنفہ کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ انھوں نے مذہب، دیسی تہذیب اور بدیسی ثقافت کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ مشرق سے بیزار ہیں، نہ مغرب سے حذر کرتی ہیں۔

حوالہ جات

- ۱۔ محمد نعیم، "انیسویں صدی میں اردو کے اصلاحی ناول"، تخلیقی ادب، شمارہ ۹ (۲۰۱۲): 283-313۔
- ۲۔ طیبہ بیگم بلگرامی، انوری بیگم (کراچی: سما ایڈیٹوریل اینڈ پبلشنگ، ۲۰۱۰)
- ۳۔ ایضاً، ۲۴۔
- ۴۔ مولوی عبدالحق، "مقدمہ"، مضمونہ انوری بیگم از طیبہ بیگم بلگرامی، ۱۱-۱۸ (کراچی: سما ایڈیٹوریل اینڈ پبلشنگ سروسز، ۲۰۱۰)
- ۵۔ محمد نعیم، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ: ۱۸۶۹ تا ۱۹۴۷ (لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۹)
- ۶۔ علامہ راشد الخیری، ستونئی (دہلی: عصمت بک ایجنسی، ۱۹۳۸)
- ۷۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۲۰۰۲)
- ۸۔ عبدالحلیم شرر، بدرالنسا کی مصیبت (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۰۱)
- ۹۔ طیبہ بیگم بلگرامی، انوری بیگم، ۶۱۔
- ۱۰۔ ایضاً، ۲۵۔
- ۱۱۔ نذیر احمد، بنات النعش (لاہور: خزانہ علم و ادب، ۲۰۰۵)
- ۱۲۔ نذیر احمد، ایامی (آگرہ: مطبع شمسی، ۱۸۹۱)
- ۱۳۔ محمد نعیم، "انیسویں صدی میں اردو کے اصلاحی ناول"،
- ۱۴۔ طیبہ بیگم بلگرامی، انوری بیگم، ۱۲۶۔

۱۵۔ مثلاً گنگا دھرنے اپنی کتاب لیلاوتی و چندراوتی کا قصہ (۱۸۶۹) میں سلامتی طبع کو براہ راست تعلیم کا نتیجہ قرار دیا ہے جبکہ طیبہ بلگرامی کے زیر تجزیہ ناول میں بالواسطہ یہی دلیل پیش کی گئی ہے۔ لیلاوتی و چندراوتی کا قصہ کے تعارف کے لیے دیکھیے:

سمیرا عمر، "قصہ لیلاوتی و چندراوتی: تعارف، تجزیہ اور تدوین"، بازیافت ۲۱، شمارہ ۴۳ (۲۰۲۳): ۱۱۵-۸۵۔

<http://111.68.103.26/journals/index.php/Bazyaft/article/view/7541>

1۶. N.E. Simmonds, *Critical Issues in Jurisprudence: Justice, Law and Rights* (London: Sweet and Maxwell, 1986), 16.